ڈاکٹر غلام جیلانی برق

مَن کی دُنیا

من کی دنیا ایک ایسی پُراسرار دنیا ہے جس کی واردات و کیفیات کا ادراک ہماری عقل نارسا نہیں کرسکتی۔ یوں تو کائنات میں اور بھی بے شمار ایسی اشیاء موجود ہیں جو ہمارے فہم و ادراک سے وراتر ہیں مثلاً عقل، نظر، زمانہ، شعور، تحت الشعور، وجدان وغیرہ۔ لیکن ہم ان کے وجود کا انکار نہیں کرتے اور اپنی نافہمی کا اعتراف کرلیتے ہیں۔ دوسری طرف جب کوئی خدارسیدہ انسان ہم سے نور و سرور، وجد و مستی، غیبی طاقتوں اور آوازوں کا ذکر کرتا ہے تو ہم اسے دیوانہ و خبطی سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ دنیا کے بڑے بڑے اخلاقی و سیاسی انقلابات انہی دیوانوں کے پیدا کردہ تھے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب تک کسی جذبہ میں شدت کی جنبش و حرکت پیدا نہ ہو انسان کوئی غیر معمولی کارنامہ دکھا ہی نہیں سکتا۔ چنگیز و سکندر کی نام آوری کا سبب اُن کا جذبۂ ملک گیری تھا۔ برلا اور ڈالمیا کے تموّل کا محرّک خوفِ افلاس کا جذبہ تھا اور بڑے بڑے اہل قلم کی تخلیقات یا تو جذبۂ شہرت کا نتیجہ تھیں یا جذبۂ اصلاح و تجدید کا۔ جب تک ایک آدمی عقل کے زیر اثر رہتا ہے تو وہ ہر اقدام سے پہلے سود و زیاں کا اندازہ لگاتا، تمام خطرات کا جائزہ لیتا اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتا ہے۔ ایسا آدمی عموماً بزدل، جامد اور بے روح سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب کسی شخص پر کوئی جذبہ غالب آجاتا ہے تو اُس سے غیر معمولی اعمال سرزد ہونے لگتے ہیں۔ عشق میں فرہاد نے تنہا پہاڑ کاٹا تھا۔ ایڈورڈ ہفتم نے تخت چھوڑ دیا تھا۔ غصّے میں بھائی اور باپ تک کو قتل کردینے کے واقعات آئے دن دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ہمارے شعراء، اولیا اور مصلحین زبردست حسّاس اور "جذباتی" نہ ہوتے تو غالباً ان کے کارناموں پر دنیائے انسانی یوں نازاں نہ ہوتی۔ جب ان دیوانوں پر کوئی بری روح مسلط ہوجاتی ہے تو یہ چنگیز، ہلاکو، فرعون، قارون اور نمرود بن جاتے ہیں۔ اور جب ان پر کسی پاک و عظیم روح کا قبضہ ہوجاتا ہے تو یہ موسیٰ و ابراہیمؑ، سقراط و افلاطون، اقبال و گوئٹے اور حسین و حیدر کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

اچھی اور بُری روح کا تسلط۔

گو ہماری محدود عقل اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے لیکن لاکھوں انسانوں کا مشاہدہ و تجربہ شاہد ہے کہ بعض اوقات اچھی یا بُری ارواح دماغ پر قابض ہو جاتی ہیں۔ اور یہ تسلط یا تو عارضی اور شدید ہوتا ہے اور یا دھیما اور دائمی۔ اگر یہ عارضی تسلط بُری روح کا ہو تو جسم کو شدید کوفت ہوتی ہے۔ ہاتھ پاؤں مُڑ جاتے ہیں، مُنہ سے ڈراؤنی چیخیں نکلتی ہیں۔ چہرہ بھیانک ہو جاتا ہے اور آنکھوں سے آگ برسنے لگتی ہے۔ ایسا آدمی یا تو مہمل جملے منہ سے نکالتا ہے یا عربی، فارسی، انگریزی وغیرہ کی عبارتیں پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ اور یا بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کو "جن پڑ جانا" کہتے ہیں۔ اس حملے کے دوران میں جو جُملے مریض کی زبان سے نکلتے ہیں وہ اس کے اپنے نہیں ہوتے۔ بلکہ اس روح کی کارستانی ہوتی ہے جو دماغ پر چھا جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کا ایک ناقص سا منظر اُس لڑکی میں بھی نظر آتا ہے جسے ہپناٹزم کا ماہر بے ہوش کر کے اپنا ارادہ اس پر مسلط کر دیتا ہے اور وہ لڑکی اس کی خواہش کے مطابق بولتی، ہاتھ پاؤں ہلاتی، بلکہ کسی سہارے کے بغیر ہوا تک میں معلق ہو جاتی ہے۔ مجھے اس طرح کے کئی مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں ایک طالب علم کو دیکھا کہ حملے کے دوران میں اُس کے ہاتھ پاؤں مُڑ گئے۔ وہ بار بار چیخیں مارتا اور ساتھ ہی ایسی زبانوں کی عبارتیں پڑھتا جن سے وہ ناآشنا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں ہوشیارپور کے ایک سینما ہال میں بنگال کے ایک پروفیسر نے ایک لڑکی کو اسٹول پر کھڑا کر کے پہلے بے ہوش کیا۔ اس کے بعد وہ اسٹول کھینچ لیا اور وہ لڑکی ہوا میں معلق ہو کر رہ گئی۔ گورنمنٹ کالج کیمبلپور کے ایک لکچرار اشفاق حسین صاحب آج سے چند ماہ پہلے کراچی گئے اور وہاں انہیں دل ڈوبنے کے دورے پڑنے لگے۔ جب لمبی علاج ناکام رہا تو کسی نے ایک معزز خاتون کا پتہ دیا جو ارواح کو طلب کر سکتی تھی۔ چنانچہ یہ اس خاتون کے پاس گئے۔ اس نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور کہنے لگی کہ میں خود تو کچھ نہیں جانتی البتہ اتنا کر سکتی ہوں کہ کسی بڑے طبیب یا ڈاکٹر مثلاً بقراط، بوعلی سینا وغیرہ کی روح کو طلب کر دوں اور آپ اس سے مشورہ لے لیں۔ اس وقت ان کے ساتھ ایک ایسے صاحب بھی تھے جو پامسٹری میں دل چسپی رکھتے تھے انہوں نے اصرار کیا کہ سب سے پہلے پامسٹری کے مشہور پروفیسر کیرو کی روح کو طلب کیا جائے۔ چونکہ وہ خاتون روح کے تسلط سے بے ہوش ہو جاتی تھی اور اس کا جسم ٹوٹ کر رہ جاتا تھا اس لیے اس نے کہا کہ وہ ایک دن میں صرف ایک ہی روح کو طلب کر سکتی ہے۔ فیصلہ یہی ہوا کہ اس روز کیرو کو بلایا جائے۔ اس کے بعد ہوا یہ کہ اس خاتون کے کہنے پر پروفیسر اشفاق کے ساتھی

نے اپنی ہتھیلی میز پر رکھ دی۔ اور وہ خاتون بے ہوش ہو گئی۔ اس حالت میں اس کے منہ سے چھ سات منٹ تک ایک تقریر جاری رہی جس کی ابتدا یوں ہوئی۔ گڈ مارننگ ایوری باڈی۔ کیرو سپیکنگ۔ (GOOD MORNING EVERY BODY CHAIRO SPEAKING) اور اس کے بعد ہاتھ کی تمام لکیروں پر سیر حاصل بحث کی۔ آخر میں کہا گڈ بائی۔ اور پسینے میں ڈوبی ہوئی وہ خاتون دوبارہ ہوش میں آ گئی۔

ان واقعات پر عقل و علم کی روشنی میں بحث کرنا ناممکن ہے۔ عقل انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتی لیکن یہ ایسے ٹھوس واقعات ہیں جو تخلیق آدم سے آج تک لاتعداد انسانوں کے مشاہدہ میں آئے۔ ان انسانوں میں اولیا و انبیا تک شامل تھے۔ اور ہم اس قیاس آرائی پر مجبور ہو گئے کہ کائنات میں کچھ ایسی خفیہ طاقتیں موجود ہیں جو انسانی دماغ کو اپنے بس میں کر لیتی ہیں۔ یہ طاقتیں بُری بھی ہوتی ہیں اور اچھی بھی۔ بُری کو اصطلاحاً جن یا شیطان کہا جاتا ہے۔ اور اچھی کو فرشتہ۔ ایک رسول کی وحی کی کیفیت بھی کچھ اسی طرح کی ہوتی ہے۔ کہ ایک مقدس فرشتہ پیغمبر کے دماغ اور زبان کو اپنے بس میں کر لیتا ہے اور اس وقت اس کے منہ سے ایسے کلمات نکلتے ہیں جو پیغمبر کے اپنے نہیں ہوتے بلکہ اس فرشتے کے ہوتے ہیں۔ ہمارے حضور صلعم کی وحی کے متعلق قرآن میں کچھ اسی قسم کی بات کہی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے: اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ، ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ - وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ - وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيْمٍ (تکویر)

(یہ قرآن ایک جلیل و بزرگ فرشتے کا کلام ہے۔ جو صاحبِ قوت ہے۔ ربّ العرش کے پاس مقیم ہے، آسمانوں میں اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ وہ بے حد دیانت دار ہے۔ تمہارا نبی کسی جن کے زیر اثر یعنی مجنون نہیں۔ تمہارے رسولؐ نے اس بزرگ فرشتے کو ایک روشن افق پر دیکھا تھا۔ یہ فرشتہ امورِ غیب کو بتانے میں بخل سے کام نہیں لیتا اور یہ قرآن کسی مردود شیطان کا کلام نہیں)

دماغ پر فرشتے کے اس شدید اور عارضی تسلط کا سلسلہ وحی کے خاتمہ کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ اور تسلطِ جن کے واقعات اس قدر شاذ و نادر ہیں کہ قابلِ توجہ نہیں بن سکتے۔ البتہ خفیہ طاقتوں کے دوامی اور دھیمے تسلط کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنے اردگرد دو قسم کے انسان عموماً نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جو نیکی کی سیدھی راہ پر چل رہے ہیں۔ ان کے سینے سرور و اطمینان سے لبریز ہیں اور

ان کا دماغ خوف واضطراب سے آزاد ہے۔ ان کے ہر اقدام کا نتیجہ کامیابی ومسرت ہے۔ ان کے دماغ میں جو اسکیم یا منصوبہ آتا ہے وہ خود ان کے لیے اور دوسروں کے لیے منفعت بخش ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کا معمول جھوٹ، فریب، بددیانتی اور فتنہ انگیزی ہے اور ان کے دماغ میں جو تجویز یا اسکیم آتی ہے وہ خود ان کے لیے اور دوسروں کے لیے نقصان رساں ہوتی ہے۔ ان دونوں طبقوں کو دیکھ کر یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اوّل الذکر افراد کو کسی ایسی خفیہ روح کی رہنمائی حاصل ہے جو ان کے دماغ میں صرف نیک ارادے اور تجاویز ڈالتی ہے۔ اور دوسرے طبقہ پر کوئی خبیث روح یا شیطان مسلط ہے جو اسے ہمیشہ بدکاری اور بداندیشی کی ترغیب دیتی ہے۔ پہلے طبقے سے لوگ محبت کرتے ہیں اور دوسرے سے نفرت۔ ان دونوں طبقوں کی اس دماغی کیفیت کے متعلق کچھ اشارات قرآنِ حکیم میں بھی ملتے ہیں۔ مثلاً:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا ..... (سجدہ)

(جو لوگ اللہ کو اپنا رب بنا کر اس راہ پر عزم واستقلال سے چلنے لگ پڑتے ہیں۔ ہم ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ جو انہیں یہ بشارت دیتے ہیں کہ خوش ہو جاؤ کہ اب خوف وخطر کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی)

تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ جب فرعون کے سپاہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بعد از ولادت قتل کرنے کے لیے ان کے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو ان کی والدہ سخت گھبرائیں۔ جب کوئی اور راستہ نظر نہ آیا تو بچے کو ایک صندوق میں رکھ کر دریائے نیل میں پھینک دیا۔ قرآن میں اللہ کہتا ہے:

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْہِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْہِ فَاَلْقِیْہِ فِی الْیَمِّ۔

(کہ ہم نے والدۂ موسیٰؑ کو بذریعۂ وحی کہا تھا کہ بچے کو دریا میں پھینک دے)

اُمِّ موسیٰؑ کی اس تجویز کو اللہ نے اس لیے وحی کہا ہے کہ یہ خیال اللہ نے اس کے دماغ میں کسی فرشتہ کی وساطت سے ڈالا ہوگا۔ غور فرمائیے کہ شہد کی مکھی کس صناعی وچابک دستی سے چھتہ تیار کرتی اور اس میں شہد بھرتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مکھی کو یہ فن کس نے سکھایا؟ قرآن کہتا ہے کہ وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ یعنی اللہ نے اسے بذریعہ وحی اس ہنر کی تعلیم دی۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سوچنا اور سوجھنا کسی خارجی خفیہ طاقت کے تصرف سے عمل میں آتا ہے۔ بدکاروں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

اِسْتَحْوَذَ عَلَیْھِمُ الشَّیْطَانُ فَاَنْسٰھُمْ ذِکْرَ اللّٰہِ (مجادلۃ)

(بدکاروں پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے جو انہیں اللہ سے بالکل غافل کر دیتا ہے)
اس سے واضح تر آیت یہ ہے:
وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ (بقرہ)
(سیہ کار لوگوں کی دوستی شیاطین سے قائم ہو جاتی ہے جو انہیں نور کی دنیا سے نکال کر اندھیرے کی طرف لے جاتے ہیں)
یہ "اندھیرے کی طرف لے جانے" کی تاویل شاید یہی ہو کہ شیاطین ان سیہ کاروں کے دماغ میں برے ارادے اور تجاویز ڈالتے ہیں۔

امریکہ کے مشہور پروفیسر ولیم جیمز اپنی کتاب VARIETY OF RELIGIOUS EXPERIENCE میں ڈاکٹر ہٹی کا تجربہ یوں پیش کرتا ہے:
"میرا تجربہ یہ ہے کہ خدا پر بھروسہ رکھنے والا تمام خطرات سے محفوظ گزر جاتا ہے۔ عین ضرورت کے وقت کبھی کوئی شخص پردۂ غیب سے آکر معاون ہو جاتا ہے ..... جس طرف جانا خطرناک ہو اس طرف رکاوٹیں خود بخود کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اور جو چیز مفید ہو اس کی راہ سے تمام رکاوٹیں ہٹ جاتی ہیں۔ عین وقت پر ہمت پیدا ہو جاتی ہے یا غیب سے ایسی تجویز آجاتی ہے جو مفید ہو .... ایسے آدمی کو یقین ہوتا ہے کہ مناسب وقت پر کام خود بخود ہو جائے گا۔"
عین وقت پر کوئی نئی تجویز سوجھ جانا، ایک ڈرامہ نگار کے دماغ میں کوئی نیا پلاٹ آجانا اور مقالہ لکھتے وقت نیا نکتہ یا خیال سوجھنا ایسے واقعات ہیں جو ہر صاحب قلم کو عموماً پیش آتے رہتے ہیں۔ دماغ میں یہ نئے خیالات کہاں سے آتے ہیں اور کون ڈالتا ہے؟ ان سوالات کا جواب ایک عام آدمی یہ دے گا کہ یہ سب کچھ دماغ کی کارستانی ہے۔ اور ہمارے صوفیا یہ کہیں گے کہ خیالات عقل کی تخلیق ہیں اور عقل پر ایک خفیہ طاقت ہر وقت مسلط رہتی ہے۔ اگر یہ طاقت اچھی ہو تو تخلیقاتِ عقل اچھی ہوں گی ورنہ بری۔ صوفیا ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ایک آدمی کے دماغ پر شیطان و فرشتہ بیک وقت اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ فرشتہ اللہ کی طرف بلاتا ہے اور شیطان بدی کی ترغیب دیتا ہے۔ اثر اندازی کا یہ مقابلہ برسوں جاری رہتا ہے۔ اگر یہ آدمی اللہ کا ہو جائے تو شیطان مایوس ہو کر اسے چھوڑ جاتا ہے اور اگر یہ مائل بہ شر ہو جائے تو پھر فرشتہ رخصت ہو جاتا ہے۔ انسان جس قوت کی طرف مائل ہوتا ہے اسی کا اثر غالب ہو جاتا ہے۔

خدا

انیسویں صدی کے مغربی سائنسدانوں کا خیال یہ تھا کہ کائنات کے اس عظیم کارگاہ کے پیچھے کوئی دانع کارفرما نہیں۔ بلکہ بجلی کے مثبت و منفی ذرّات، جن سے یہ کائنات تعمیر ہوئی، اتفاق سے پیدا ہو گئے تھے ان گنت صدیوں کی تعمیر و تخریب کے بعد یہ مہ و انجم اور یہ کہسار و چمن زار اتفاقاً وجود میں آگئے تھے۔ یہ موسموں کا تغیر و تبدّل، یہ نور و ظلمت کا حیرت انگیز نظام، ہر دل کا بہتّر مرتبہ دھڑکنا، مکھی کے انڈے سے ہر مقام پر مکھی ہی پیدا ہونا، اور آم کے درخت میں صرف آم لگنا آڑو نہ لگنا محض اتفاق ہے۔ بیسویں صدی میں جب سائنس نے کتابِ کائنات کے چند اور اوراق اُلٹے اور فطرت کے ہر پہلو میں اسے کمال ہی کمال نظر آیا، کہیں کوئی بدنظمی، فتور اور نقص دکھائی نہ دیا، تو سائنس سوچنے لگا کہ تخلیق و تدوین کے یہ کرشمے اتفاقیہ نہیں ہو سکتے چنانچہ پروفیسر ولیم میکبرائیڈ نے کہا،

"کیا کوئی شخص سنجیدگی سے یہ کہہ سکتا ہے کہ کائنات میں نظم و توازن قائم رکھنے والی قوت برق پاروں کی اتفاقیہ ترکیب و آمیزش سے پیدا ہو گئی ہے؟"

آئن سٹائن لکھتا ہے،

"کائنات پر ایک دماغ حکومت کر رہا ہے، اس سے بحث نہیں کہ وہ دماغ ریاضی دان کا ہے یا آرٹسٹ کا، شاعر کا ہے یا سب کا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہماری حیات کو پُر معنی بناتی ہے، کاروبارِ زندگی میں جان ڈالتی ہے۔ اُمیدوں کو اُبھارتی ہے اور جہاں علم ناکام ہو جائے وہاں ہمارے ایمان کو مستحکم بناتی ہے۔"

اٹھارویں صدی کا ایک صاحبِ نظر ڈرہم کہتا ہے:

"آغاز سے اب تک جتنے انسان پیدا ہوئے۔ سب کے چہرے الگ الگ تھے، اور اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر سب چہرے یکساں ہوتے تو قطعاً معلوم نہ ہو سکتا کہ باپ کون ہے اور بیٹا کون، افسر کون ہے اور ماتحت کون، فلاں عورت کا شوہر کون ہے اور بھائی کون؟ ہر چیز کا ہر شخص مالک بن بیٹھتا۔ چہروں کا یہ اختلاف بہت بڑی حکمت کا حامل ہے اور اس کا انتظام کوئی ایسی ہستی کر رہی ہے جس کی دانش کا کوئی کرانہ نہیں۔"

جو خدا کائنات کے ہر شعبے کا انتظام کر رہا ہے۔ سیاروں کو ان کی معیّنہ گذرگاہوں پر چلا رہا ہے، سمندروں کا کروڑوں ٹن پانی ہوا کے کندھوں پر لاد کر ہماری کھیتوں پر برسا رہا ہے۔ پھولوں

کو رنگ و بو دے رہا ہے اور عنادل کو سوز و ساز۔ وہ انسانی احوال و معاملات پر بھی اثر انداز ہوگا۔ ہو گا نہیں۔ یقیناً ہے۔ جس طرح مکھی کے انڈے سے آج تک مچھر پیدا نہیں ہوا۔ اور آک کے درخت میں آج تک آم نہیں لگے۔ اسی طرح انسان کی طویل تاریخ میں بدکاری کا نتیجہ آج تک اچھا نہیں ہوا۔ اور نہ نیکی کا انجام کبھی خراب رہا۔ ہر عمل کے ساتھ ایک نتیجہ بندھا ہوا ہے۔ بلندی سے گرنے کا نتیجہ چوٹ، آگ میں ہاتھ ڈالنے کا نتیجہ سوزش، سستی کا نتیجہ رسوائی، محنت کا نتیجہ سربلندی ہے وقس علیٰ ہذہ۔ ہم اعمال کے انتخاب میں آزاد ہیں چاہیں تو محنت کریں اور چاہیں تو سست رہیں۔ لیکن نتائج بھگتنے پر مجبور ہیں۔ ہم ان نتائج کو کسی چال یا فریب سے نہیں ٹال سکتے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نتائج کہاں سے آتے ہیں؟ انہیں اٹل کس نے بنایا؟ ازل سے اب تک ان میں یکسانیت کیوں ہے؟ جواب ایک ہی ہے کہ جو طاقت مچھر اور مکھی تک نگرانی کر رہی ہے وہ انسانی اعمال و افعال سے غافل نہیں ہو سکتی۔ اس طاقت کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے انسان عظیم بن جاتا ہے۔ اور اس سے بچھڑ جائے تو حقیر و ذلیل رہ جاتا ہے۔

اللہ سے رابطہ

جس طرح انسانی تعلقات میں کئی درجے ہوتے ہیں۔ مثلاً پہلے شناسائی، پھر دوستی، پھر گہری محبت اور آخر میں فرہاد و قیس الا عشق۔ اسی طرح اللہ سے تعلقات کے کئی مراحل ہیں۔ مثلاً پہلے ترک گناہ، پھر بلند اعمالی، پھر شب بیداری اور آخر میں فنا فی الذات۔ لیکن میں آپ کو اس کٹھن سفر میں بہت دور نہیں لے جانا چاہتا۔ صرف پہلی منزل ہی کی سیر کرانا چاہتا ہوں۔ اللہ سے رابطہ پیدا کرنے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان گناہ کو چھوڑ دے۔ جھوٹ، فریب، فحش کاری، بددیانتی، بے رحمی، رعونت، لالچ، اور دیگر رذائل کو ترک کرنے کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھائے کہ اعمال و خیالات میں بلندی و پاکیزگی پیدا کرے۔ اس اقدام کا پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ دماغ خوف و خطر سے آزاد ہو جائے گا۔ نہ دنیا میں کسی محاسبے کا ڈر رہے گا اور نہ آخرت میں۔ دوسرا یہ کہ نگاہ میں رعنائیت آ جائے گی۔ یہ دنیا جو بدکاروں کے لیے آنسوؤں کی ایک وادی ہے حسین و جمیل نظر آنے لگے گی۔ حرص و طمع ناپید ہو جائیں گے۔ دنیوی لذات حقیر معلوم ہونے لگیں گی۔ دنیا سے دل بے نیازی کی مسرت سے معمور ہو جائے گی۔ اور اس فقیری کے مقابلے میں شانِ سکندری ہیچ معلوم ہوگی۔ تیسرے یہ کہ تسلیم و رضا کی نعمت مل جائے گی۔ اس کائنات پر ایک جھلملتی سی نظر ڈالنے کے بعد یہ حقیقت کھل جاتی

ہے کہ اللہ کی حکمت و دانش لامحدود و بے کراں ہے۔ اس کی ہر تخلیق اعجاز اور ہر فعل سراپا حکمت ہے وہ جو کچھ کرتا ہے ہماری بہتری کے لیے کرتا ہے۔ اس کی گھٹائیں ہماری کھیتیوں کے لیے اور ہوائیں رشتۂ حیات قائم رکھنے کے لیے ہیں۔ اس کے آفتاب ہمارے پھل پکا رہے ہیں۔ اس کے ماہتاب ہماری راتوں کو حسین و پُرسکون بنا رہے ہیں۔ اس کی زمین ہمارا بسیرا، ہمارا ذخیرہ خانہ، ہماری سیرگاہ، اور آغوشِ راحت ہے۔ اگر اللہ کی ہر تخلیق۔ اس کا ہر اقدام اور ہر فعل ہمارے فائدے کے لیے ہے تو کیا ہمارے لیے بہتر نہیں کہ ہم اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیں اور دُکھ اور سکھ دونوں کو نعمت سمجھ کر قبول کر لیں؟ ہم آئے دن ریلوں، موٹروں اور کشتیوں میں سوار ہونے کے بعد اپنے آپ کو ملاحوں اور ڈرائیوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ ملاح ہوشیار ہے، دریا کے پُرخطر مقامات سے آگاہ ہے، وہ ہماری کشتی کو ساحل تک بہ حفاظت پہنچا دے گا۔ یہ دنیا بھی ایک سمندر ہے جس میں زندگی کی نیا رواں ہے۔ ہمارا کھیون ہار اللہ ہے۔ وہ راہ کی چٹانوں سے واقف اور منزل سے شناسا ہے۔ اُس پر بھروسہ کیجئے۔ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیجئے۔ آپ پر کوئی زد نہیں پڑے گی اور اس تسلیم و رضا سے آپ کی زندگی مسرور، پُر اطمینان اور سرمدی بن جائے گی۔ مارکس اریلیس کی یہ صدا کتنی روح افروز ہے:

"اے رب جو کچھ تجھے پسند ہے وہ مجھے بھی پسند ہے۔ تیرے ہر عمل میں مجھے بہتری نظر آتی ہے۔ تو جس چیز کے لیے جو وقت مقرر کرے وہ بالکل درست ہے۔ تیرے طمانچے مجھے ماں کی تھپک معلوم ہوتے ہیں۔ تمام اشیا کا وجود تجھی سے ہے۔ تو ہی سب کا مبدا و منتہا ہے۔ اے رب! یہ حسین کائنات تیری بستی ہے۔"

وجد و کیف

انسانی دماغ مختلف کیفیات کا منبع و مرکز ہے۔ کیفیت کی ایک قسم وہ ہے جو اچھا نغمہ سن کر پیدا ہوتی ہے۔ ایک وہ جو عمدہ شعر سے طاری ہوتی ہے۔ ایک وہ جو مشاہدۂ جمال و تماشائے حسن سے پیدا ہوتی ہے اور ایک وہ ہے جو ذکرِ الٰہی سے جنم لیتی ہے۔ اس کیفیت کا رنگ ہی جداگانہ ہے۔ یہ تمام دیگر کیفیات سے عمیق، دیرپا اور سرور آور ہوتی ہے۔ ذکرِ الٰہی بظاہر اسمائے الٰہی کی تکرار ہے لیکن درحقیقت روح کا سفر ہے، منبع نور و قوت یعنی خدا کی طرف۔ یہی وہ سفر ہے جو روح میں بالیدگی سرمدیت اور لاانتہایت پیدا کرتا ہے۔ حیات کائنات سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ روح میں یقین

وایمان کی حرارت پیدا ہوتی ہے۔ کائنات کے جسم میں ایک روحِ عظیم رواں دواں نظر آنے لگتی ہے، اور پہاڑوں کے ان بلند و پست سلسلوں اور ستاروں کی بکھری ہوئی محفل میں چشمِ وجدان ایک ایسا رشتۂ وحدت دیکھ لیتی ہے جو زمان و مکان کی تمام تفریقات کو مٹا دیتا ہے۔ اس وجدان کے مقابلے میں عقل ایک نہایت ادنیٰ اور سطحی چیز معلوم ہوتی ہے۔ فرانسس تھامپسن کیا خوب فرماتے ہیں:

"مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے گرد ایک روحانی وجود ہے۔ جس طرح نفس میں ایک ایسی سطح ہے جسے تحت الشعور کہتے ہیں، اسی طرح ایک بلند تر سطح بھی ہے جو فلسفہ و خرد کے ادراک سے باہر ہے۔ اور جسے روحانی عالم کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ ہماری روح کی طاقت کا سرچشمہ یہی عالم ہے۔ اور اسی بلند سطح پر پہنچ کر ہمیں اپنی غیر معمولی طاقتوں کا احساس، روحِ کل کا وجدان اور اپنے لافانی ہونے کا ایمان حاصل ہوتا ہے۔"

پروفیسر ولیم جیمز کیا پتے کی بات کہتے ہیں:

"میں یوں محسوس کرتا ہوں کہ اس دنیا سے پرے بھی ایک دنیا ہے جس کی سرحدیں اس مادی دنیا سے ملی ہوئی ہیں۔ ہمارے بلند مقاصد و تحریکات وہیں سے آتے ہیں۔ ہماری زندگی اسی سے متاثر ہوتی ہے اور یہ تاثر ہمارے اعمال و افکار میں عظیم انقلاب پیدا کرتا ہے۔ تمام مذاہب والے اس فوق النظرت سرچشمۂ قوت کو خدا کہتے ہیں۔ خدا ایک ایسی ہستی ہے جو ہمارے اعمال پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر آسمانوں میں کوئی ایسا خدا بھی موجود ہے جو ہمارے شخصی معاملات سے قطعاً بے نیاز ہے، تو ایسا خدا بیکار محض ہے۔ اور ہمیں اس کی قطعاً ضرورت نہیں۔"

تصریحاتِ بالا کا ماحصل یہ ہے کہ خدا سے رابطہ قائم کرنے اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دینے کے بعد دل میں ایک آسمانی قسم کا سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان کو اپنی غیر معمولی طاقتوں کا احساس ہونے لگتا ہے۔ بہارستانِ کائنات کی ہر روش پر کسی کے لطیف قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ کثرت میں وحدت نظر آتی ہے اور کچھ خفیہ طاقتیں ہمارے پاکیزہ ارادوں کی تکمیل میں ہماری معاون بن جاتی ہیں۔ عقل شاید کسی منزل پر بھی میری تائید نہ کرے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر عقل وارداتِ دل سے ناآشنا رہے تو رازِ زندگی کو قطعاً نہیں پا سکتی۔ بقولِ اقبال:

یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار
شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں